ایک درس

حج کا مقصد

پرویز

آپ نے یہ الفاظ ہر محراب و منبر اور ہر سٹیج اور پلیٹ فارم سے سُنے ہوں گے، اور بار بار سُنے ہوں گے کہ اسلام نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ الفاظ تو آپ نے بارہا سُنے ہوں گے، لیکن یہ کسی کی زبان سے نہیں سُنا ہوگا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کیا ہیں اور اسلام ان کا حل کیا پیش کرتا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جو قوم خود اپنی مشکلات کا حل دریافت نہ کر سکتی ہو ــــــ اس کے لئے اُسے غیروں کے دروازے پر دستک دینی پڑتی ہو ــــــ وہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل کیا پیش کر سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جب غیر اقوام ہمارا یہ دعویٰ سُنتی ہیں تو استہزاء کی ہنسی ہنس کر کہتی ہیں کہ پہلے اپنی مشکلات کو تو حل کر لو، اس کے بعد نوعِ انسان کی مشکلات کے حل کا دعویٰ کرنا!

یہ درحقیقت "مذہب" کی ٹیکنیک ہے کہ وہ نہایت مقدس اور خوش آئند الفاظ کے ذریعے اپنے معتقدین کو خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے اور اُن کے ذہن کو کبھی اس طرف نہیں آنے دیتا کہ وہ ان الفاظ کا مفہوم معلوم کریں یا یہ سوچیں کہ ہم جو دعویٰ کرتے ہیں اُس کا عملی ثبوت کیا ہے۔ مذہب کا سارا دارومدار بلا مفہوم الفاظ کے دہرائے چلے جانے اور بلا نتیجہ رسومات ادا کئے جانے پر ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام بھی الدین نہیں رہا، مذہب بن چکا ہے، اس لئے ہم کبھی نہ الفاظ کے مفہوم کی طرف آتے ہیں اور نہ ہی اپنے دعاوی کے عملی ثبوت کی طرف۔

اس وقت تمام اقوامِ عالم گوناگوں مشکلات کا شکار ہیں۔ میں ان میں سے ایک ایک پرابلم کا حل قرآنِ مجید کی روشنی میں پیش کئے چلا آ رہا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ میری یہ کوشش قرآنی الفاظ، اصطلاحات، اور تصورات و نظریات کا متعین مفہوم پیش کرنے تک محدود ہے۔ عملی نتائج سے اس کے دعاوی کا ثبوت بہم پہنچانا میرے بس کی بات نہیں، کیونکہ وہ ثبوت تو قرآنی نظام کے قیام ہی سے بہم پہنچ سکتا ہے، اور نظام کا قیام کسی فرد کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ اُمّت کی اجتماعی کوششوں ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ بایں ہمہ میں گذشتہ قریب تیس ۳۰ سال سے اپنی ان کوششوں کو جاری رکھے ہوئے ہوں۔ ایک تو اس لئے کہ قوم کے اربابِ بصیرت اس حقیقت کو سمجھ سکیں کہ اس وقت ہم میں جو کچھ اسلام کے نام سے ہو رہا ہے وہ مذہب ہے، دین نہیں۔ اور دوسرے اس لئے کہ اس سے شاید آنے والی نسلیں استفادہ کر کے دین کا نظام قائم

کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اقوامِ عالم متعدد گوناگوں مشکلات اور پریشانیوں کا شکار ہیں...... میں اس وقت ان میں سے صرف ایک مسئلہ کو لوں گا جو درحقیقت مشکل ترین مسئلہ ہے اور نوعِ انسان کے موجودہ مصائب اور ممکنہ تباہی کا موجب ہے۔ اور وہ ہے نیشنلزم۔ میں اس موضوع پر اس سے پہلے بھی بہت کچھ لکھ چکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ خود اقوامِ مغرب اس کے ہاتھوں کس قدر نالاں ہیں اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے کس قدر مضطرب و بے قرار۔ لیکن انہیں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں اس نشست میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ قرآنِ کریم نے اس کا نظری حل کیا بتایا اور عملی پروگرام کیا تجویز کیا۔

———(۱)———

نوعِ انسان کی تمدنی یا معاشرتی زندگی کی ابتداء کب اور کہاں سے ہوئی، مغرب کے علماءِ علم الانسان نے اس باب میں خاصی تحقیق کی ہے لیکن وہ اس باب میں ابھی تک کسی متعین نتیجے پر نہیں پہنچ سکے۔ قرآنِ کریم اس قسم کی تحقیقات کے متعلق بحث نہیں کرتا۔ وہ بات اس مقام سے شروع کرتا ہے جو اس کے پیشِ نظر منزل تک پہنچنے کا آغازِ سفر ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا...... ۝ (۱۰/۱۹) "نوعِ انسان شروع میں ایک اُمت، ایک جماعت، ایک گروہ تھی۔ اس کے بعد انہوں نے آپس میں اختلاف پیدا کر لئے"۔ ان اختلافات کا نتیجہ تھا کہ وہ پہلے مختلف خاندانوں میں اور اس کے بعد قبیلوں میں بٹ گئے اور اس تفرقہ کو نسلوں تک پھیلا دیا۔ باہمی تقسیم اور تفریق کی یہ خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ تا آنکہ اس نے مختلف قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ اس نے ایک سیاسی تصورِ حیات یا مسلکِ زندگی کا پیرہن اوڑھ لیا۔ اس کا نام نیشنلزم ہے جو اس وقت پوری کی پوری نوعِ انسان کو محیط ہے۔ اس سے نہ کرۂ ارض، کرۂ ارض رہا ہے اور نہ ہی انسان، نوعِ انسانی کا فرد۔ کرۂ ارض کو فرضی لکیریں کھینچ کر مختلف ممالک میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور ان ممالک میں بسنے والے انسانوں کو مختلف قوموں کا نام دے دیا گیا۔ یہ قومیں بھیڑیوں کی طرح تاک میں بیٹھی رہتی ہیں کہ ان میں سے کسی کو کب اونگھ آئے اور یہ اس پر جھپٹ پڑیں۔ اس وقت پوری نوعِ انسان کی یہی کیفیت ہے، اس میں نہ اقوامِ مغرب کی تخصیص ہے اور نہ اقوامِ مشرق کی تمیز۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :-

نیشنلزم

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس　　مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے سیّار

قرآنِ کریم نے بتایا کہ نوعِ انسان اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی جس مصیبت کا شکار ہو گئی تھی اس سے نجات دلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے وحی کی راہنمائی کا آغاز کیا۔ سورۂ بقرہ میں ہے:-

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا

اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ط...... ه (۲/۲۱۳)

چونکہ نوعِ انسان کو پھر سے ایک وحدت میں تبدیل کرنا مقصود تھا، اس لئے اللہ تعالےٰ نے بعثتِ انبیاء کا سلسلہ شروع کیا جو انہیں اختلافی زندگی کے تباہ کن عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوشخبری سناتے۔ وہ اپنے ساتھ قوانینِ خداوندی کا ضابطہ لاتے تاکہ وہ اُس کی رُو سے ان کے اختلافی امور کا فیصلہ کریں۔

یہ تھا وحی کا مقصد اور وہ منزل جس تک کاروانِ انسانیت کو پہنچانا مقصود تھا۔ یعنی انہیں ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھالنا۔ اس کے لئے وحی نے کہا کہ جو لوگ اس مقصد سے متفق ہیں وہ، رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کے اختلاف کے باوجود ایک اُمّت کے افراد ہیں۔ جو اس سے انکار کرتے ہیں وہ ان کے بالمقابل دوسری اُمّت کے افراد۔ اسی کو ایمان اور کفر کے امتیاز سے تعبیر کیا گیا ہے، اور سیاسی اصطلاح میں اسے "دو قومی نظریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

عالمگیر برادری

اگرچہ ہر نبی کا یہی پیغام تھا، لیکن اس کی عملی تشکیل حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں وجود پذیر ہوئی۔ اُنہوں نے ماں باپ، برادری، قوم، اور وطن تک کو چھوڑ کر ایمان کی بنیادوں پر ایک نئی اُمّت کی تشکیل کی اور اُس کا ایک اجتماعی نظام قائم کیا۔ نظام یا اجتماعیت کے لئے ایک محسوس مرکز کا وجود لاینفک ہوتا ہے۔ انہوں نے وحی خداوندی کی راہنمائی میں مکّہ کے مقام پر ایک علامتی مرکز تعمیر کیا، جسے کعبہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِىْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ؕ (۳/۹۵)

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو قوم، وطن، رنگ، نسل کے امتیازات سے بلند ہو کر خالص انسانیت کے لئے وجود میں لایا گیا تھا، مکّہ کی مبارک وادی میں (خانہ کعبہ) تھا۔ یہ کاروانِ انسانیت کی منزلِ مقصود کے لئے نشانِ راہ تھا۔

اِسے، تمام انسانی نسبتوں سے بلند و بالا قرار دینے کے لئے، اللہ تعالےٰ نے "اپنا گھر" (بَيْتِيَ۔ ۲/۱۲۵) کہہ کر پکارا۔ یہاں ایک اہم نکتہ کا سمجھ لینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ ویسے تو کائنات کی ہر شے خدا ہی کی ہے۔ لیکن اس نے جس چیز کو خاص طور پر "اپنی" کہہ کر پکارا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، نہ اس پر کسی کا قبضہ ہو سکتا ہے۔ (مثلاً) بیت اللہ (اللہ کا گھر) یا ارض اللہ (اللہ کی زمین)۔

مندرجہ بالا آیت میں کہا گیا ہے کہ کعبہ کو النّاس (نوعِ انسان) کی اجتماعیت کا مرکز بنایا گیا۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کعبہ اور حج کے سلسلے میں جس قدر آیات قرآنِ کریم میں آئی ہیں اُن میں ہر جگہ "النّاس" ہی کہا گیا ہے۔ یہ اس لئے کہ، جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، وحی خداوندی کا مقصود و مطلوب

لِلنّاس کا مقصد

نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی تشکیل تھا۔ اس لئے جس مقام کو اس برادری کا مرکز قرار دیا گیا اسے "لِلنّاس" ہی کہا جانا چاہیئے تھا۔ اور یہی قرآن نے کیا۔

اب یہ دیکھئے کہ نوعِ انسان کی اس مرکزیت سے مقصود کیا تھا۔ فرمایا:۔

جَعَلَ اللّٰہُ الْکَعْبَۃَ الْبَیْتَ الْحَرَامَ قِیٰمًا لِّلنَّاسِ......o (5/97)

اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو واجب الاحترام مقام قرار دیا تاکہ اس مرکزیت سے نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑی ہونے کے قابل ہوسکے۔

یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے دو لفظوں میں سمٹا کر رکھ دیا گیا ہے۔ انسانیت، قوموں میں تقسیم ہو تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہیں ہو سکتی۔ مثال کے طور پر آج دنیا کی قومیں دو حصّوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ ایک سپر پاورز ——— یعنی بڑی مہیب قوتوں کی مالک قومیں۔ اور دوسری، کمزور اور غیر نشو ونما یافتہ (UNDEVELOPED) قومیں۔ کمزور قوموں کا طاقتور قوموں کے سہارے کا محتاج ہونا تو ظاہر ہے۔ یہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو ہی نہیں سکتیں۔ لیکن طرفہ تماشا یہ ہے کہ خود سپر پاورز اپنی قوت کے لئے ان کمزور قوموں کی محتاج ہوتی ہیں۔ جس قوم کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کمزور قومیں ہوں، وہ اتنی ہی زیادہ طاقتور سمجھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بڑی قوم کی یہ انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان کمزور قوموں کو زیادہ سے زیادہ امداد یا امداد کا لالچ دے کر اپنے ساتھ رکھ سکیں، لیکن ایسا کبھی نہ ہونے دیں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہوسکیں۔

لیکن اگر قومیتوں کے مٹ جانے کے بعد نوعِ انسان اُمّتِ واحدہ بن جائے تو اُسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے کسی خارجی سہارے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ یہ ہے کعبے کی مرکزیت کا اوّلین ثمرہ۔ یعنی قیاماً لِلنّاس۔ نوعِ انسان کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذریعہ۔

اب آگے بڑھیئے۔ اس وقت دنیا میں کہیں امن نہیں۔ چھوٹی قومیں ہوں یا بڑی، سب ایک دوسرے سے ڈری اور سہمی ہوئی رہتی ہیں۔ جب قوموں کی یہ حالت ہے تو افراد، خوف و ہراس کے جس جہنم میں زندگی گذارتے ہیں، اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس وسیع و عریض کرۂ ارض پر کوئی چھوٹے سے چھوٹا مامن ایسا نہیں جہاں کوئی فرد یا قوم اپنے آپ کو محفوظ یا مامون سمجھ لے۔ کعبے کی مرکزیت کی دوسری خصوصیت کے متعلق قرآن نے کہا:۔

جائے امن

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَۃً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا......o (2/125)

اور ہم نے کعبہ کو نوعِ انسان کی اجتماعیت کا مرکز بنایا اور ایسا مقام جہاں کسی کو کسی قسم کا خوف و خطر نہ ہو۔

دوسری جگہ ہے: وَمَنْ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا......o (3/97) "جو بھی اس نظام میں داخل ہو جائے گا جس کا یہ مرکز ہے، اُسے امن کی ضمانت مل جائے گی"۔

بات واضح ہے، دنیا میں خوف و خطر تو مختلف قومیتوں کا پیدا کردہ ہے۔ جب ان کی جگہ ایک ایسی اُمّت وجود میں آجائے گی جس میں یہ تفریق نہیں ہوگی تو وہ بھائیوں کی طرح امن و سلامتی سے رہے گی۔ ایسے نہ کسی خارجی خطرہ کا اندیشہ ہوگا، نہ داخلی خلفشار کا ڈر۔ سوچئے کہ اس سے یہ کرۂ ارض جو اس وقت جہنم زار بن رہا ہے، کیسا امن و سلامتی کی جنّت بن جائے گا!

موجودہ قومیتوں کی تقسیم کی ایک لعنت یہ بھی ہے کہ کسی ایک ملک کا باشندہ، دوسرے ملک میں قدم تک نہیں رکھ سکتا جب تک وہ اس سے اجازت نامہ (VISA) حاصل نہ کرلے۔ کعبہ کے متعلق کہا:۔

جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ..... (۲۲/۲۵)

یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے، اس گھر کے دروازے سب کے لئے یکساں طور پر کھلے ہیں، کسی کو یہاں آنے کی ممانعت نہیں، کسی سے اجازت نامہ حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ تمام انسانوں کے خدا (ربّ النّاس) کا گھر ہے، اس لئے اس کے دروازے ہر انسان کے لئے کھلے رہیں گے۔

یہی نہیں کہ جس کا جی چاہے یہاں آجائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے بعد دعا یہ مانگی تھی کہ اس خطۂ زمین میں کچھ پیدا نہیں ہوتا جو لوگوں کے لئے وجہ کشش ہو سکے۔ بارالہا! تو ایسا کردے کہ لوگوں کے دل اس طرف مائل ہو جائیں اور وہ فوج در فوج اِدھر آنے لگ جائیں۔ (۱۴/۳۷)۔

یہ تھیں اس گھر کی خصوصیات جسے تمام نوعِ انسان کے لئے مرکز قرار دیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ خصوصیات مٹی اور پتھر کے کسی مقام یا گھر کی نہیں۔ یہ خصوصیات اس نظام کی ہیں جس کا مرکز یہ گھر قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح (مثلاً) ہم کہتے ہیں کہ ماسکو کی پالیسی یہ ہے اور واشنگٹن نے یہ طے کیا ہے تو اس سے مراد ماسکو اور واشنگٹن کے شہر نہیں ہوتے۔ اس سے مراد وہ مملکتیں ہوتی ہیں جن کے یہ شہر مراکز ہیں۔

اسی طرح "کعبہ" سے مراد وہ نظامِ خداوندی' وہ قرآنی مملکت ہے، جس کا یہ مرکزی مقام ہے۔

———— (۰) ————

حضرت ابراہیمؑ کے مقدس ہاتھوں اس مرکز کی تعمیر ہوئی۔ اس کے بعد آپ، صدیوں پر پھیلے ہوئے تاریخ کے اوراق کو الٹ کر، چھٹی صدی عیسوی میں آجایئے جہاں وہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہوا جس کا مرکز کعبہ تھا۔ اس نظام کے قیام کے لئے سب سے پہلے ایک اُمّت تشکیل کی گئی جو رنگ، نسل، خون، وطن کے امتیازات کو مٹا کر خالص ایمان کی بنیادوں پر وجود میں آئی تھی۔ اس اُمّت کے وجود کا مقصد کیا تھا، اسے قرآن نے ان چند الفاظ میں نہایت جامعیت سے بیان کر دیا جب کہا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ...... (۳/۱۰۹) "تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے نوعِ انسان کے لئے پیدا

کیا گیا ہے"۔ غور کیجئے! جس طرح کعبہ کا مقصد نوعِ انسان کی فلاح و بہبود تھا اُسی طرح اس اُمّت کی بعثت کا مقصد بھی پوری کی پوری انسانیت (لِلنَّاس) کی خیر طلبی تھا۔ اِس مقصد کے حصول کے لئے اس اُمّت نے ایک نظام قائم کیا۔ اس نظام کی رُو سے اس اُمّت کا فریضہ یہ قرار دیا گیا کہ

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط...... ۵ (۲/۱۴۳)

اس طرح ہم نے تمہیں ایک ایسی اُمّت بنایا جو تمام نوعِ انسانی سے یکساں فاصلے پر رہے۔ نہ کسی کی طرف یونہی جھکی ہوئی، نہ کسی سے یونہی کھنچی ہوئی۔ فریضہ تمہارا یہ ہے کہ تم نوعِ انسانی پہ نگاہ رکھو کہ اس کا قدم غلط سمت کی طرف نہ اُٹھنے پائے۔ اور تم پہ تمہارے نظام کی مرکزی اتھارٹی (رسُول) نگاہ رکھے کہ تم غلط راستہ اختیار نہ کر لو۔

یہاں پھر "شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" کہا گیا ہے۔ یعنی تمام نوعِ انسان پر نگران۔ اِن خصوصیات کی حامل اُمّت کو "ملّتِ ابراہیمیؑ" (۲/۱۳۰) کی پیروکار کہہ کر پکارا گیا۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ کی روش پر چلنے والی اُمّت۔

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا گیا تھا: اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط (۲/۱۲۴) "نوعِ انسان کی امامت LEADERSHIP تمہارے حصّے میں آئے گی"۔ اور اسی بنا پر اس اُمّت سے کہا: وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ط...... (۲/۱۲۵) "تم منصب و مقامِ ابراہیمؑ کے حصول کو اپنی تگ و تاز کی جولان نگاہ بناؤ"۔ یعنی جس طرح حضرت ابراہیمؑ کو نوعِ انسان کی امامت کا سزاوار قرار دیا گیا تھا اسی طرح تم بھی اس نظام کے قیام سے، جس کا مرکز کعبہ ہے، عالمگیر انسانیت کی لیڈر شپ حاصل کرو۔

اِس اُمّت نے جو نظام قائم کیا تھا، اس کی بنیاد باہمی مشاورت پر تھی۔ (۴۲/۳۸)۔ اِس مشاورت کی روزمرّہ کی شکل تو صلوٰۃ کے اجتماعات تھے ——— آپ غور کیجئے کہ مشاورت کا حکم اور اقامتِ صلوٰۃ کا حکم ایک ہی سانس میں دیا گیا ہے۔ (۴۲/۳۸) لیکن پوری مملکت کے مسائل کے لئے مشاورت کے اجتماعات اِس سے کہیں زیادہ وسیع (بلکہ عالمگیر) پیمانے پر ہونے ضروری تھے۔ اُمّت کے اس عالمگیر اجتماع کو حج کہہ کر پکارا گیا ———۔ اس کے علاوہ نسبتاً چھوٹے پیمانے پر جو اجتماعات منعقد کئے جانے ضروری تھے انہیں عمرہ کہا گیا۔ اس اجتماعِ عظیم کا آغاز بھی حضرت ابراہیمؑ نے کیا تھا جب انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ... (۲۲/۲۷) "تم اعلان کر دو، تمام انسانوں کو دعوت دو کہ وہ حج کے اجتماع میں شرکت کے لئے آئیں"۔ اس اُسوۂ ابراہیمیؑ کے اتباع میں اِس اُمّت پر بھی یہ فریضہ عائد ہو گیا کہ وہ اِن اجتماعات کے انعقاد کا اہتمام کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ اجتماعات اصلاً تو اُمّت کی باہمی مشاورت کے لئے ہوں گے، لیکن ان میں شرکت کے لئے تمام انسانوں (النَّاس) کو دعوت دی گئی ہے۔ بہ حیثیت مبصّر شریک ہوں گے۔ اِس سے مقصد کیا ہے، اس کے متعلق ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا تھا

کہ اَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ ...... (۲۲/۲۷) "حج کے لئے تمام لوگوں کو دعوت دو"۔ اسی طرح امّتِ مسلمہ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے حج کے متعلق بھی کہا کہ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ط ...... (۳/۹۶) "جو لوگ بھی (اَلنَّاسِ) وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں، انہیں چاہیئے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے (لِلّٰہِ) حج کے اجتماع میں شرکت کریں"۔ آپ غور کیجئے کہ یہاں بھی اَلنَّاس کہا ہے، اسے مؤمنین (مسلمانوں) تک محدود نہیں رکھا گیا۔

عربوں کے ہاں حج کا اجتماع زمانہ، قبل از اسلام میں بھی ہوتا تھا۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جب حضرت ابراہیمؑ تعمیرِ کعبہ[1] سے فارغ ہوئے ہیں تو ان سے کہا گیا تھا کہ حج کے اجتماع کا اہتمام کریں اور لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دیں۔ لیکن جس طرح، جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس کے بلند و بالا پروگرام کے عملی اجزاء، بے معنی رسومات بن کر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح عربوں میں حج کے اجتماع نے بھی (کم و بیش) ایک میلہ کی شکل اختیار کر رکھی تھی، اور حجِ ابراہیمیؑ کے مناسک اور شعائر، مشرکانہ اور فاسقانہ (بلکہ جاہلانہ) رسوم بن کر رہ گئے تھے۔ بایں ہمہ اسے اہمیت بڑی حاصل تھی۔ اس اعتبار سے، تمام عربوں کی عمرانی زندگی کا مرکز تھا، اور قریش کو اس کی تولیت کی وجہ سے خاص امتیازی پوزیشن حاصل تھی۔ مادہ کے اعتبار سے اس لفظ (حج) کے معنی قصد و ارادہ کے بھی ہیں اور زورک دینے کے بھی۔ زمانہ قبل از اسلام میں حج کے اجتماع میں، علاوہ دیگر امور، قبائل کے باہمی جھگڑے نمٹائے جاتے تھے اور زیادتی کرنے والوں کو ان کی دراز دستیوں سے روکا جاتا تھا۔ لیکن یہ روکنا تلوار کے ذریعے نہیں ہوتا تھا، دلائل و براہین کی رُو سے ہوتا تھا۔ یہیں سے لفظ حجت ہے جس کے معنی "دلیل" کے ہیں۔ اس جہت سے قرآن دلائل کو اَلْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ... (۶/۱۴۹) کہا گیا ہے۔ اس لفظ کے ان بنیادی معانی اور تصورات سے اس اجتماع کا مقصد سامنے آجاتا ہے۔ یعنی دلائل و براہین پر مبنی مشاورت سے مملکت کے معاملات کا حل تلاش کرنا، اور غلط کاروں کو ان کے اقدامات سے روکنے کی تدابیر سوچنا۔

قرآن کریم نے عربوں کے اس اجتماع کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ اسے دین کے نظام میں ایک بنیادی ستون قرار دیا۔ فتحِ مکہ سے پہلے (سنہ ۸ھ تک) کعبہ (کفار) قریش کی تحویل میں تھا اس لئے وہاں قرآنی انداز کے اجتماع (حج) کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ فتحِ مکہ کے بعد، سنہ ۸ھ کا حج تو کم و بیش سابقہ روش پر ادا ہوا۔ لیکن سنہ ۹ھ میں اسے قرآنی شکل دے دی گئی۔ اس میں حضورؐ خود تو تشریف نہیں لے گئے، لیکن حضرت ابوبکرؓ صدیق کو نمائندہ مملکتِ قرآنیہ

حجِ اسلام

---

[1] ایسا نظر آتا ہے کہ یہ مکان حضرت ابراہیمؑ سے بھی پہلے (کسی زمانے میں) تعمیر ہوا تھا لیکن بعد میں یہ مرورِ زمانہ سے کھنڈر بن گیا اور اس کی صرف بنیادوں کے نشانات باقی رہ گئے تھے جن پر حضرت ابراہیمؑ نے دیواریں کھڑی کی تھیں۔ (۲/۱۲۷)۔

کی حیثیت سے، قافلۂ حجاج کا سربراہ بنا کر بھیجا۔ اس اجتماع میں کم و بیش تمام سابقہ رسوم و مناسک کو برقرار رکھا، لیکن انہیں مشرکانہ اور جاہلانہ آمیزشوں سے پاک اور صاف کر گئے۔ اس سے پہلے حج کی سب سے بڑی خصوصیت وہ اعلانِ عظیم تھا جو مدینہ کی اسلامی مملکت کی طرف سے، غیر مسلموں (بالخصوص قریش) کے ساتھ تعلقات کا منشور تھا اور جو سورۂ توبہ میں مذکور ہے۔ سنہ ۱۰ھ میں یہ اجتماع خود ذاتِ رسالتمآبؐ کے زیرِ لوا منعقد ہوا اور اس میں حضورؐ نے وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو عالمگیر انسانیت کے لئے صحیفۂ آزادی قرار پاتا ہے۔ اس کا نقطۂ ماسکہ یہ تھا کہ انسانوں کے خود ساختہ، رنگ و نسل، خون و زبان، وطن و قومیت۔ ذات پات۔ برادری۔ قبائل، ہر قسم کے امتیازات کو مٹا کر، خالص ایمان کی بنیادوں پر، انسانوں کی عالمگیر برادری کی تشکیل۔ خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی یہ اجتماع، انہی مقاصدِ عالیہ کے حصول کا ذریعہ تھا جنہیں قرآن نے متعین فرمایا تھا۔ اس میں وسیع و عریض مملکتِ اسلامیہ کے نمائندگان شریک ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ اُن لوگوں کو بھی خصوصی دعوت دی جاتی تھی جنہیں ارکانِ عمالِ حکومت کے خلاف کسی قسم کی شکایت ہوتی۔ چونکہ یہ اجتماع مملکت کے دور دراز علاقوں سے آنے والوں پر مشتمل ہوتا تھا، اس لئے میدانِ عرفات میں ان کا باہمی تعارف ہوتا تھا۔ اسی نسبت سے اسے عرفات کہتے تھے۔ (یعنی باہمی تعارف کی تقریب) سربراہِ مملکت یا اس کا نمائندہ اپنے خطاب میں اس پروگرام کا اعلان کرتا جو آئندہ سال کے لئے تجویز ہوتا تھا۔ اس کے بعد، یہ نمائندگانِ مملکت، منیٰ کے میدان میں جمع ہوتے۔ وہاں اور تین دن تک قیام کر کے اس پروگرام کی تفصیلات پر غور و خوض کرتے۔ مملکت کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا جاتا۔ مستغیثین کی شکایات کا ازالہ کیا جاتا۔ اور یہ سب کچھ دلائل و حجت کی رُو سے کیا جاتا، دھاندلی اور سینہ زوری سے نہیں۔ ان فیصلوں اور تجویزوں کو ساتھ لے کر، یہ نمائندگان، اپنے اپنے مقامات کی طرف واپس جاتے۔

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ مکہ، اس وادی میں واقع ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔ (۱۴/۳۷) اس علاقہ میں اگر لاکھوں انسانوں کا اجتماع ہو تو سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوگا کہ ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہوگا؟ قرآن کریم اس قسم کے اہم سوال کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس نے کہا

قربانی؟

کہ اس اجتماع میں شرکت کرنے والے اپنی "خوراک" اپنے ساتھ لائیں۔ سادہ ظاہر ہے کہ گوشت سے بہتر خوراک کوئی نہیں ہو سکتی تھی؛ اس نے کہا کہ آنے والے کچھ فالتو اونٹ اپنے ساتھ لائیں۔ آتے وقت ان پر بے شک سامانِ تجارت وغیرہ لاد لیں، اور یہاں پہنچ کر انہیں ذبح کریں۔ اُن کا گوشت خود بھی کھائیں، اور مکہ کے اُن غرباء کو بھی کھلائیں جنہیں عام حالات میں گوشت نصیب نہیں ہوتا۔ سورۂ حج کی آیات (۲۲/۲۸؛ ۲۲/۳۳؛ ۲۲/۳۶) میں یہ تمام تفصیل درج ہے۔ ان کے لئے "قربانی" کا لفظ سارے قرآن میں کہیں نہیں آیا۔ (نہ ہی ان جانوروں کے متعلق جنہیں بقر عید پر قربانی کہہ کر ذبح کیا جاتا ہے)۔

—(۰)—

اِس کے بعد حج کے اُس بنیادی مقصد کی طرف آیئے جس کی تشریح کو ہم نے قصداً اس مقام کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ پہلے تمہیداً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ دین کے مقاصد محض نظری تصورات یا ذہنی عقائد نہیں ہوتے، وہ محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں اور دین کے دعاوی کا ایسا عملی ثبوت بنتے ہیں جس سے انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ حج کے سلسلے میں بھی قرآن کریم نے اس کا اسی قسم کا مقصد بتایا۔ سورۂ حج میں ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ تعمیرِ کعبہ سے فارغ ہوئے تو اللہ تعالٰے نے ان سے کہا:-

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۝ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ ...... ۝ (۲۲/۲۷-۲۸)

تم لوگوں میں اعلان کردو کہ وہ حج کے لئے یہاں آیا کریں ——— دنیا کے دور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے، پا پیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چور ہو جائیں۔

وہ یہاں اس لئے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کی (یعنی نوعِ انسان کی) منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

نوعِ انسان کی منفعت

اس میں "لِیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ"...... کے الفاظ بڑے گہرے غور و تدبر کے متقاضی ہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ لوگ آئیں اور اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں کہ یہ نظام ان کی منفعت کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مشاہدہ اس چیز کا ہو سکتا ہے جو محسوس طور پر سامنے آ جائے۔ یہ دعوت "النّاس" کو دی جاتی تھی جس میں اُمتِ مسلمہ بھی شامل ہے اور غیر مسلم بھی۔ اِس اُمت کے افراد یہ دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے اور غیر مسلم بھی اس کا مشاہدہ کر لیں کہ یہ نظام عالمگیر انسانیت کے لئے کس قدر منفعت بخش ہے۔ یہ نفع سامانیاں بھی ان کے سامنے محسوس شکل میں آئیں گی۔

واضح رہے کہ قرآن کریم نے حسنِ عمل۔ کارِ خیر۔ "ثواب" کے کاموں کے پرکھنے کا ایک ہی معیار بتایا ہے۔ اور وہ یہ کہ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْكُثُ فِی الْاَرْضِ ...... (۱۳/۱۷) "دنیا میں بقا اسی عمل کے لئے ہے جو تمام نوعِ انسان (الناس) کے لئے نفع بخش ہو"۔ دین اور اس کے لئے ارکان و شعائر کی علتِ غائی یہ ہے کہ ان سے ایسے نتائج مرتب ہوں جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت کا موجب ہوں۔ حج کے اجتماع میں ان منفعت بخش نتائج کو سامنے لایا جاتا تھا، اور اسی کے لئے تمام انسانوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ لِیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ......

قرآنی نظامِ مملکت میں غیر مسلموں کو شریکِ حکومت تو نہیں کیا جا سکتا، لیکن بعض فنی اور ٹیکنیکل معاملات میں اُن سے مشورہ کیا جا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ ایسا کیا کرتے تھے، اور اس زمانے میں غیر مسلم مکے میں آیا جایا کرتے تھے۔ (کتاب الخراج، امام یوسفؒ۔ بحوالہ شبلی نعمانیؒ)۔ غیر مسلموں کو حج کے اجتماع میں مبصّر کی حیثیت سے شریک ہونے کی دعوت دی جائے گی تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام اُن کی بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

لیکن اس کے لئے ایک شرط ضروری ہے، اور وہ یہ کہ اس میں کوئی شخص کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا جو ان مقاصد کے خلاف جائے جنہیں خدا نے مقرر کیا ہے۔ ایسا کرنے کو شرک سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۲۲/۲۵)۔ اسی بنا پر مشرکینِ مکہ کو اس میں شرکت سے روک دیا گیا تھا۔ (۹/۳، ۹/۲۸)۔

بہرحال مقصد اس اجتماع سے یہ تھا کہ نوعِ انسان کو بتایا اور دکھایا جائے کہ قرآنی نظام ان کی منفعت اور بہبود کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔

(۰)

ہمارا حج

یہ تھا اجتماعِ حج کا مقصد۔ اُس زمانے میں دین اپنی اصلی شکل میں موجود تھا، لیکن جب وہ مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اس کے مقاصد نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ مذہب کرتا یہ ہے کہ دین کی روح (مقصد اور غایت) کو فنا کر دیتا ہے لیکن اس کے شعائر اور مناسک کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھتا ہے، اور ان کی رسمی پابندی پر بڑا زور دیتا ہے۔ اس سے قوم اس خوش فہمی میں مبتلا رہتی ہے کہ احکامِ خداوندی کا اتباع ہو رہا ہے۔ اس سے انہیں ایک عقیدتمندانہ اطمینان حاصل ہو جاتا ہے جو اُن کے اپنے ہی دل کا پیدا کردہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر عوام ان رسوم و مناسک کی انتہائی جذب و عقیدت سے پابندی کئے جاتے ہیں، یہ دیکھے بغیر کہ ان کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ اسی میں مذہب کی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔ لوگ اگر سوچنے لگ جائیں تو مذہب کے مفاد و مفاصد ختم ہو جاتے ہیں۔

ان تصریحات کی روشنی میں آپ موجودہ حج پر نگاہ ڈالیں اور سوچیں کہ کیا اس سے وہ مقاصد حاصل ہوتے ہیں جن کے لئے اس کا انعقاد ضروری قرار دیا گیا تھا۔ بات یہاں سے چلی تھی کہ وحی کی غایت اور انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ رنگ، نسل، زبان، خون، وطن اور قومیت کے اختلافات کو مٹا کر (جن کی وجہ سے نوعِ انسان ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے) اُسے پھر سے ایک عالمگیر برادری کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ اس کے لئے ایک نظام تجویز ہوا تھا جس کا مرکز کعبہ تھا، اور جس کے اجتماع کا نام حج تھا۔ حج کا اجتماع اب بھی ہوتا ہے، اور پہلے سے کہیں زیادہ جوش و خروش کے ساتھ وسیع تر پیمانے پر۔ ایک ایک اجتماع میں پندرہ پندرہ، بیس بیس لاکھ حاجی شریک ہوتے ہیں۔ چالیس، پچاس ہزار کا انبوہِ عظیم تو صرف پاکستان سے اس میں شرکت کے لئے جاتا ہے۔ حکومت کا ایک پورا محکمہ اس کے انتظامات کے لئے وقف ہے۔ وہ سال بھر اسی میں مصروف رہتا ہے۔ ان چالیس، پچاس ہزار حاجیوں کے لئے (مملکت کا انتہائی مشکلوں سے حاصل کردہ) زرِ مبادلہ جس قدر صرف ہوتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ یہ حاجی، شدت کی گرمی اور دیگر ناسازگار حالات میں سفر کی صعوبات برداشت کرتے ہیں۔ اس میں مہینوں لگ جاتے ہیں جن میں وہ کوئی اور کام ہی نہیں کر پاتے۔

وقت، توانائی، روپیہ کے اس صرف اور اس قدر جانکاہ مشقتوں کا ماحصل کیا ہوتا ہے؟ ان افراد کا جذباتی اطمینان کہ ہم نے ایک فریضہ ادا کر لیا ہے۔ محض افراد کا جذباتی اطمینان تو کوئی ایسی خصوصیت

نہیں جس کی بنا پر اسلام کو ایک منفرد نظامِ حیات قرار دیا جا سکے! اس قسم کا اطمینان تو تمام اہلِ مذاہب اپنے اپنے طور پر حاصل کر سکتے اور کر لیتے ہیں!

علاوہ ازیں دنیا کے تمام مسلمان اُسی طرح مختلف قوموں اور وطنوں میں منقسم ہیں جس طرح غیر مسلم۔ ان ممالک اور اقوام کے افرادِ حج کے اجتماع میں بھی اپنے اپنے وطنی اور قومی تشخص کو برقرار رکھتے ہیں۔ مذہبی تفریق اس پر مستزاد ہے۔ اس کی شدت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ چند سال اُدھر کی بات ہے کہ پاکستان کے ایک بہت بڑے مذہبی رہنما نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ ہم تو حرم کعبہ میں بھی، امام کعبہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے —— اپنی جماعت الگ کرتے ہیں۔

یہ ہے کیفیت ہمارے اس اجتماع کی جس کا مقصد وطنوں اور قومیتوں کے امتیازات کو مٹا کر تمام نوعِ انسان کو ایک مرکز پر جمع کرنا تھا۔ وہی جب اپنی اصلی شکل میں موجود تھا تو مسلمانوں کا (حج تو ایک طرف) نمازوں تک میں اجتماع' مخالفین کے دلوں میں' دھڑکن پیدا کر دیا کرتا تھا اب کیفیت یہ ہے کہ مسلمانوں کے قریب ایک ارب آبادی کے بحرِ ذخار میں اسرائیل مملکت کی حیثیت خس و خاشاک سے زیادہ نہیں۔ گذشتہ پچیس تیس سال سے لاکھوں کا یہ اجتماع عرفات کے میدان میں رو رو کر خدا سے فریاد کرتا چلا آ رہا ہے کہ غاصب اور مغضوب علیہ اسرائیل کا بیڑا غرق ہو، اور اسرائیل ہے کہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ہے "مذہب کے حج" کا نتیجہ۔ الدین کا حج ہوتا تو اس کے صرف اعلان پر دنیا کی بڑی سے بڑی غلط کوش قوم کپکپانے لگ جاتی تھی۔ اب یہ اُمت غیر مسلموں کی چھوٹی سی چھوٹی قوموں سے ڈرتی اور کانپتی ہے۔ حج کے عظیم اجتماع میں خالی دعائیں مانگ کر چلی آتی ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو جھوٹا اطمینان دے لیتی ہے کہ یہودی "مغضوب علیہ" قوم ہیں اس لئے یہ تباہ ہو کر رہیں گے۔ کمزور انسان اپنے مخالف کو گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے ہیں۔

اُمت کی یہ حالت ہے اور اس کے مذہبی پیشوا اس پر مسلسل زور دیئے جاتے ہیں کہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ارکانِ اسلام کی رسمی طور پر پابندی کرتے رہیں اور ان کی غرض و غایت اور مقصود و مطلوب کے متعلق کچھ نہ سوچیں۔ اسی میں ہماری مختلف مملکتیں بھی اپنا اپنا مفاد مضمر دیکھتی ہیں اور مذہبی پیشوائیت کے فروغ کا سامان بہم پہنچا کر انہیں تاکید کرتی ہیں کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اسی کے پیشِ نظر، ابلیس نے اپنے مشیروں سے کہا تھا: ؎

یہ ہماری سعیٔ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا ملوکیت کے بندے ہیں تمام

ہے طواف و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کُند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام!

(ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ۔ ارمغانِ حجاز)

ابلیس کا یہ سحر اس وقت ٹوٹے گا جب یہ قوم کتاب اللہ کو اپنی زندگی کا ضابطہ بنائیگی۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو خدا کا یہ انتباہ کارفرما ہو کر رہے گا کہ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ ؏ (۴۷/۳۸)۔

اگر یہ (قرآن سے اسی طرح) رُوگرداں رہے تو ان کی جگہ کوئی دوسری قوم لے لیگی، اور وہ ان جیسی نہیں ہوگی۔

خدا کے وعدوں کی طرح اس کی وعیدیں بھی اٹل ہوتی ہیں! لیکن اس استبدالِ قومی میں جو تباہی آتی ہے، وہ بڑی قیامت خیز ہوتی ہے۔ والسلام

پرویز

(۰)